Date of Publication : 02-09-2014 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 Sep. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 September2014
Issue: 34, Vol.:73

۸ تا ۱۴ ستمبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۳۴، جلد نمبر: ۷۳

اردو میں درس و تدریس کے مسائل

نصابی کتب کے حوالے سے

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں (غوث منزل، تالاب ملا ارم، رام پور-244901، یوپی)

موجودہ دور میں ابتدائی وثانوی درجات کے طلبہ کو اردو کی تعلیم حاصل کرنے میں جو مسائل درپیش ہیں ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ایک طرف اچھے، تجربہ کار، ہمدرد، بے غرض اور پُرخلوص اساتذہ کا فقدان ہے تو دوسری طرف سب سے بڑی پریشانی نصابی کتابوں کی عدم فراہمی اور عدم دستیابی ہے۔ عام شکایت یہ ہے کہ کتابیں وقت پر شائع نہیں کی جاتیں۔ بہ وقت تمام شائع ہو بھی جاتی ہیں تو ان کو اسکولوں، کالجوں اور مارکیٹ میں بک سیلرز کے پاس وقت پر نہیں پہنچایا جاتا۔ نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے لے کر سالانہ امتحان سر پر آجانے تک طلبہ اردو کی کتابوں کے لیے سرگرداں اور پریشان رہتے ہیں۔ یہ رویہ بیشتر سرکاری اداروں کا ہے۔ اس تساہلی کا مقصد اردو کو نقصان پہنچانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ عام بک سیلرز کا رویہ اور طرز عمل بھی اردو کی کتابوں کے ساتھ نہایت گھٹیا، عامیانہ اور متعصبانہ ہوتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر سرکاری اداروں اور پریس سے کتابیں نہیں منگاتے یا آرڈر دیتے بھی ہیں تو اس امر میں کوئی سرگرمی نہیں دکھاتے کہ کتابیں وقت پر طلبہ کو دستیاب ہو سکیں۔ پھر اگر ان کے پاس کتابیں آ بھی جاتی ہیں تو ان کی بہتر طور پر اس طرح تشہیر نہیں کرتے جیسی وہ دوسری زبانوں کی تشہیر کرتے ہیں۔

عام طور پر اردو کی سرکاری نصابی کتابیں انتہائی گھٹیا، ردی اور بیکار قسم کے اخباری کاغذ پر شائع کی جاتی ہیں۔ ایسی کتابوں کو طلبہ صحیح ڈھنگ سے پڑھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں کیوں کہ ان میں کتابت وطباعت کا بھی کوئی معیار نہیں ہوتا، جب کہ یہی سرکاری ادارے انگریزی اور ہندی (متفرق مضامین) کی کتابیں انتہائی نفیس، دیدہ زیب، سفید، دبیز اور اعلیٰ کاغذ پر شائع کرتے ہیں اور ان میں موجود تصاویر بھی بہت خوب صورت اور ملٹی کلر میں ہوتی ہیں جب کہ اردو کی کتابوں میں تصاویر انتہائی بھدی اور غیر واضح ہوتی ہیں۔ اردو کی کتابوں میں کتابت اور ہندی انگریزی کی کتابوں میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی نفاست اور ان کے معیار میں بھی زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔

زمانے، وقت، سماجی ضرورت اور عصری حالات وتقاضوں کے تحت اردو نصاب میں برسوں کوئی ترمیم، تحریف، تنسیخ اور حذف واضافہ نہیں کیا جاتا۔ یہ رویہ چھوٹے بڑے ہر کلاس کی کتابوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ اترپردیش میں الٰہ آباد بورڈ ملک میں کسی بھی صوبے کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے مجموعی طور پر پچاس لاکھ سے زیادہ طلبہ ہر سال امتحان کے لیے بیٹھتے ہیں۔ اس وقت راقم کے پیش نظر انٹرمیڈیٹ کی اردو نظم ونثر کی دونوں کتابیں بہ عنوان 'ادبی سی پارے' موجود ہیں۔ ان کتابوں کا نصاب 1956 میں ترتیب دیا گیا تھا۔ دونوں کتابوں کا پیش لفظ یکساں ہے اور صفحات کی مجموعی تعداد محض 359 ہے۔ یہ کتابیں جو ابتداءً لیتھو کی کتابت کرا کے لیتھو مشین پر شائع کی گئی تھیں، آج بھلے ہی فلم بنا کر آفسیٹ سے چھپ رہی ہوں لیکن ان کی کتابت یا کمپوزنگ دوبارہ نہیں کرائی گئی ہے۔

تخلیقی ادب میں دس سال کے عرصے میں ہی کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آجاتی ہے لیکن ان کتابوں کو ادب کے عصری تقاضوں اور وقتی ضرورتوں سے دور ہی نہیں بلکہ محروم رکھا گیا ہے۔ کیا آج کے افسانے کا مزاج وہی ہے جو ساٹھ کی دہائی میں تھا؟ کیا آج کے طالب علم کو سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک کے بعد ادب میں جدیدیت، مابعد جدیدیت کے رجحانات اور نظریات، تجرید، جدید افسانہ، روایتی افسانہ اور موجودہ دور میں لکھے جانے والے افسانے کے معیار ومزاج کو سمجھنے کا کوئی حق نہیں؟ کیا شاعری کا معیار ومزاج اور قارئین کا شعری رجحان وہی ہے جو ساٹھ سال پہلے تھا؟ کیا ہماری آج کی غزل ماضی کی روایتی غزل کے مقابلے ہماری زندگی سے زیادہ قریب نہیں آگئی ہے؟ کیا آج کی غزل نے وسیع کینوس کے ساتھ زندگی کے ہر رنگ کو اپنے دامن میں نہیں سجا لیا ہے؟ کیا ان ساٹھ برسوں میں کئی نئی شعری اصناف وجود میں نہیں آگئی ہیں؟ ان سارے سوالات کا جواب یقیناً اثبات میں ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ 1956 میں ترتیب دی گئی کتابوں کو آج 2013 میں 57 سال گزرنے کے باوجود Renew نہیں کیا گیا ہے یا ان کی جدید کاری نہیں کی گئی ہے؟ اتنے برسوں میں تو دو نسلیں جوان بھی ہوئیں اور پروان بھی چڑھیں لیکن ان 57 سالوں میں ہمارا نصاب وہیں کا وہیں ہے جب کہ اس عرصے میں کتنے ہی اعلا شعری اور نثری شاہکار وجود میں آگئے، کتنے ہی اعلا قلم کاروں نے اردو دنیا سے اپنی عظمت وشہرت کا لوہا منوایا لیکن نصابی کتابوں کے حوالے سے ہمارا طالب علم ان سارے ناموں سے ناواقف ہے۔ واضح رہے یہاں سردست انٹرمیڈیٹ کی کتابوں کے تناظر میں بات کی جا رہی ہے۔ بڑے دکھ کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں درسی کتب میں تقریباً ایک سو قلم کاروں کی شعری ونثری تخلیقات موجود ہونے کے باوجود ان میں کسی ایک بھی خاتون قلم کار کی کسی تخلیق کو شائع نہیں کیا گیا ہے۔ کہاں ہیں نسائی ادب کی حمایت وموافقت کرنے والے؟ کیا آج اس امر کی ضرورت نہیں کہ ہم پروین شاکر، زاہدہ حنا، صغریٰ مہدی، ادا جعفری، واجدہ تبسم، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر جیسی شہرۂ آفاق تخلیق کاروں اور شاعرات کو بھی ان طلبہ میں روشناس کرائیں۔ جن بچوں کو شروع سے ادبی ذوق ہوتا ہے وہ تو اپنی پسند کے بھی قلم کاروں کو پڑھتے ہی ہیں لیکن یہاں نصابی کتب کے حوالے سے نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

اردو کی جو سرکاری نصابی کتابیں جونیئر کلاسز کے لیے شائع کی گئی ہیں ان میں کمپوزنگ کی اغلاط کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔ ان کتابوں کو پروف ریڈنگ اور تصحیح جیسے عمل سے کوسوں دور رکھا گیا ہے۔ ان کتابوں کے صفحات کا پرنٹ ایریا بھی یکساں نہیں ہے۔ ایک ہی کتاب میں بے ضرورت کمپیوٹر کے کئی کئی فونٹ استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں چودہ، کہیں سولہ اور کسی صفحے پر اٹھارہ۔ نثری اسباق میں سے پورے پورے پیراگراف یا تو سرے سے غائب ہی کر دیے گئے ہیں یا ایک مضمون کا پیراگراف کسی بالکل ہی الگ موضوع کے مضمون سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اغلاط کی ایسی کثیر تعداد، کمپوزنگ کے ایسے گھٹیا معیار اور کتاب کی ترتیب کے ایسے بے ڈھنگے پن کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کیا جا

بلکہ پورے یقین اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ سب ایک پلاننگ کے تحت کیا جا رہا ہے تاکہ بچے یا تو اردو سیکھ ہی نہ سکیں اور اگر بمشکل سیکھ بھی لیں تو اس کا معیار اتنا پست اور اس قدر گھٹیا ہو کہ اس کی کوئی عزت و وقعت ہی نہ ہو سکے۔

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کتابوں کے نصابی بورڈ یا تحقیقات کے انتخاب کے تحت جن لوگوں کے نام کتاب کے ابتدائی صفحات میں درج ہوتے ہیں ان میں سے بیشتر کا اردو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس رویے کو اردو کے ساتھ مذاق جیسے سرسری الفاظ لکھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے خلاف جب تک عوام میں بیداری نہ ہوگی تب تک یہی سب کچھ چلتا رہے گا۔

راقم کو چوں کہ بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا ذوق و شوق رہا ہے اور اپنے تعلیمی دور سے ہی طلبہ کو پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری ہے اس لیے درس و تدریس کے اس 35 سالہ ماحول میں اردو، ہندی اور انگریزی کی سیکڑوں کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا ہے لیکن سرکاری اور غیر سرکاری بھی کتابوں میں ایک عجیب مشترکہ بات دیکھنے میں آئی ہے اور اسے صرف سہل پسندی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ایک کہانی جو درجہ 6 کی کتاب میں موجود ہے وہی کہانی ہندی میں ہائی اسکول کی کتاب میں بھی موجود ہے۔ راقم نے ٹیگور کی ایک معروف کہانی 'کابلی والا' بی اے میں فارسی میں پڑھی تھی، وہی کہانی جونیئر کلاسز میں اردو میں بھی موجود ہے۔ کیا درجہ 7 اور بی اے کے طالب علم کی ذہنی صلاحیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ پریم چند کی کہانی 'منتر' اگر ہائی اسکول کے نصاب میں موجود ہے تو وہی کہانی درجہ 6 کی کتاب میں بھی شامل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصابی کتابوں کی ترتیب میں بچوں کی ذہنی استعداد، ان کی عمر، صلاحیت اور ذوق و شوق کا کہیں خیال نہیں رکھا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ نئے اور پرانے قلم کاروں کا کوئی توازن موجود نہیں ہے۔ وقت و حالات اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ضرورت و اہمیت اور اس کی تعبیر کو بالائے طاق رکھ کر کتابیں شائع کردی جاتی ہیں اور بس! اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کو نصابی کتب میں جگہ دی گئی ہے یا پھر بعض قد آور ادبا اور شعرا اشاعتی اداروں سے کسی بھی طرح کے رابطہ اور تعلق کے باعث ان کتابوں میں جگہ پالیتے ہیں۔ اس طرح ادب کے نئے چاند ستاروں کا استحصال تو ہوتا ہی ہے، ساتھ ہی طلبہ ادب کے جدید رجحانات اور امکانات سے بھی نابلد اور ناواقف رہتے ہیں۔

چند اداروں کو چھوڑ کر اردو کی نصابی کتابوں کے مرتبین اور ناشرین کے پاس کتابوں کی ترتیب و تدوین کے لیے کوئی ایسا بورڈ یا پینل نہیں ہے جو بچوں کی عمر کو Catagory میں بانٹ کر اور ان کے مزاج، رجحانات یا سماجی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک منظم طریقے سے کتابوں کی ترتیب کا کام انجام تک پہنچائے۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ نصابی کتابوں کی پانچ چھ برسوں میں جدید کاری کی جائے۔ نئے موضوعات پر مضامین اور دلچسپ و بامقصد کہانیاں شامل کی جائیں۔ آج کے بچے کو جدید ٹیکنالوجی اور سائنس سے متعلق مواد چاہیے۔ دیکھا جاتا ہے کہ برسوں پہلے جن موضوعات پر مضامین شامل نصاب تھے وہ تین چار دہائی بعد بھی آج کی کتابوں میں موجود ہیں بھلے ہی وہ اپنی افادیت و اہمیت کھو چکے ہوں اور آج ان کی تعلیمی ضرورت نہ ہو۔ اکثر مرتبین بیشتر کہانیوں اور نظموں کے تخلیق کار کے نام، ان کی تعلیقات کے ساتھ لکھنے کے بجائے 'ماخوذ' لفظ لکھ کر اپنی خود ساختہ ذمہ داری سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ یہ بددیانتی سے زیادہ کچھ نہیں کیوں کہ ہر تخلیق کے ساتھ اس کے فن کار کا نام درج کرنا مرتب کی ذمہ داری اور اس کا فرض ہے۔ ہندی اور انگریزی کی نصابی کتابوں میں یہی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ کئی درسی کتابوں میں یہ خامی بھی نظر آتی ہے کہ کتاب میں شامل کہانی کے ساتھ دو سطروں میں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ اس کہانی میں کیا بات کہی گئی ہے اور اس کو لکھنے کا کیا مقصد ہے۔ ایسے مرتبین کا یہ عمل نہایت عامیانہ اور بچکانہ نظر آتا ہے۔ اس طرز عمل اور طریقہ کار سے تو کہانی کے تجسس اور بچے کی دل چسپی دونوں کو یکسر ختم کردیا جاتا ہے۔ ہندی کی درسی کتابوں میں جونیئر کلاسز سے ہی یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ ہر مضمون، کہانی، ڈرامہ یا نظم کے مصنف کا چار چھ سطروں میں مختصر لیکن جامع تعارف بھی پیش کیا جائے کیوں کہ اس سے بچوں کی معلومات بڑھتی ہے اور ان کے اندر تحقیق کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اردو کی جونیئر کلاسز کی بیشتر نصابی کتابوں کے مرتب اس طریقہ کار سے گویا بالکل نابلد اور ناواقف ہیں۔ حسن اتفاق سے کسی کتاب میں مذکورہ طرز کا تعارف مل بھی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے اس کا معیار طلبہ کے تعلیمی معیار کے بجائے اپنی ڈگریوں کے حساب سے رکھا ہے، اس لیے جیسا کہ چاہیے طلبہ اس سے مستفید نہیں ہو پاتے۔

آج ضرورت ہے کہ بے مقصد اور فضول کہانیوں، مضامین کے بجائے نصابی کتابوں میں اخلاقیات، صحت و تندرستی، کھیل کود، جدید سائنسی ترقی اور ایجادات، دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے سماجی اور جغرافیائی حالات، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی اہمیت و افادیت، جنرل نالج، جذبۂ خیر سگالی اور ہمدردی، آپسی میل جول، ملک کے تاریخی حالات و واقعات، تاریخی نوعیت کی عمارات اور ملک سے محبت و وفاداری ابھارنے والے مضامین شائع کرنے کی طرف قابل قدر توجہ دی جائے۔ وہ تعلیمی ادارے جو بچوں کے لیے درسی کتابیں ترتیب دے کر شائع کرتے ہیں انھیں اپنے نصاب میں مذکورہ امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

طلبہ کے لیے ہندی اور انگریزی میں ہر طرح کی بہترین گائڈ بکس اور جنرل نالج کی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں اس طرف یا تو سرے سے توجہ ہی نہیں دی گئی ہے یا کچھ کتابیں بازاروں میں ملتی بھی ہیں تو وہ صرف کاروباری نقطۂ نظر سے، بازارو قسم کے ناقص مواد کے ساتھ انتہائی گھٹیا اور ردی کاغذ پر چھاپی گئی ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر یا رٹ رٹا کر طلبہ امتحان میں پاس تو ہو سکتے ہیں لیکن ان میں علمی صلاحیت و لیاقت اور تعلیم کا ذوق و شوق اور جوش و جذبہ بھی پیدا ہو، یہ ضروری نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے پرائیویٹ ادارے عام معلومات یا جنرل نالج اور کوئز کے مقابلے کراتے ہیں جن میں ہر عمر کے طلبہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں لیکن اسکولوں میں اردو کے تعلق سے اس طرح کے مقابلوں کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ برسوں پہلے بیشتر اسکولوں اور کالجوں میں بیت بازی، تمثیلی مشاعروں اور ڈراموں کا اہتمام کیا جاتا تھا، ان ذرائع سے بھی بچوں میں اردو کے تئیں دل چسپی بڑھتی تھی اور وہ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے بچوں کے رسالے بھی کھنگالتے تھے۔ چوں کہ رسالوں میں بچوں کی دل چسپیوں کے سارے سامان موجود ہوتے ہیں اس لیے ماضی میں اردو رسالے بچوں اور خاص کر طلبہ کے لیے لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ اس کے برعکس آج جو صورت حال ہے اس کو بغیر کسی تبصرہ کے قارئین خود ہی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

اردو کی بربادی، تنزلی، عدم توجہی، عدم دل چسپی اور عدم تعاون بلکہ دشمنی اور مخاصمت کے ذمہ دار وہ ادارے بھی ہیں جن کو اردو کی فلاح و بہبود کے لیے کثیر رقم دی جاتی ہے اور ساری سہولیات فراہم کی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا یک نکاتی ایجنڈا صرف یہ ہے کہ کسی بھی صورت سے ہو، اردو کو نقصان پہنچنا چاہیے۔ سرکاری اداروں کے غیر ذمہ دارانہ رویے کی بھی بہت سی شکلیں ہیں۔ اگرچہ سرکاری اسکولوں میں اردو کی کتابیں مفت تقسیم کے لیے سرکاری تعاون سے ہی شائع کی جاتی ہیں، ان کی مفت تقسیم کے احکام بھی دیے جاتے ہیں اور ٹرکوں مال اسکول کے گوداموں تک پہنچتا بھی ہے لیکن اس کے بعد یہ کتابیں ردی کی دکانوں پر بکتی دیکھی جاتی ہیں اور پرچون کی دکانوں پر ان کی پڑیاں بھی بنتی دیکھی گئی ہیں۔ ظاہر ہے ان سب کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو ان کتابوں کی تقسیم کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اردو درس و تدریس میں جہاں بہت سے مسائل ہیں وہیں بہت سے والدین بھی اس کے ذمہ دار ہیں جو اپنے بچوں کی انگریزی، حساب، سائنس یا دوسرے مضامین کی ٹیوشن پر سیکڑوں یا ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن اردو کے معاملے میں ان کی یہ سوچ ہوتی ہے کہ صرف سو پچاس روپے دے کر اردو پڑھوا لی جائے۔ اس طرح بہت سے بچے فطری صلاحیت ہونے کے باوجود اردو کی اچھی تعلیم حاصل نہیں کرپاتے۔

اردو کی تعلیم کے مسائل میں اساتذہ کا انتخاب ایک اہم مسئلہ ہے۔ ایسے ماحول میں جب کہ تعلیم کا مقصد صرف روپیہ کمانا ہو یہ مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین اور دشوار ہوجاتا ہے۔ اگر چہ دنیا کے مشکل، اہم اور قابل احترام پیشوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں سب سے اہم پیشہ استاد کا ہے لیکن موجودہ دور میں اس پیشے کی جو حالت ہوچکی ہے وہ کسی سے بھی چھپی نہیں ہے۔ استاد کا کام قوم کی تعمیر حیات اور قوم کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا ہے۔ بچوں کی شکل میں قوم کا بیش قیمت سرمایہ استاد کے سپرد کیا جاتا ہے اس لیے استاد کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ضروری اور اہم ہی نہیں بلکہ ایک مقدس کام کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے۔ اس کے پیشے کا مقصد صرف روپیہ کمانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک بڑے مقصد اور مشن کے تحت اپنی خدمات انجام دینی چاہیے۔ دنیاوی دھن دولت اور عیش و آرام اس کے مقدس کام کا معاوضہ نہیں ہوسکتے۔

بہرحال استادوں، اردو اداروں، سماجی اور ادبی تنظیموں اور خود طالب علموں کی کوششوں سے اردو کی راہ میں حائل ساری دشواریوں کو رفع اور دفع کیا جاسکتا ہے۔

●●●

زمانے، وقت، سماجی ضرورت اور عصری حالات و تقاضوں کے تحت اردو نصاب میں برسوں کوئی ترمیم، تحریف، تنسیخ اور حذف و اضافہ نہیں کیا جاتا۔ یہ رویہ چھوٹے بڑے ہر کلاس کی کتابوں کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ اترپردیش میں الٰہ آباد بورڈ ملک میں کسی بھی صوبے کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے مجموعی طور پر پچاس لاکھ سے زیادہ طلبہ ہر سال امتحان کے لیے بیٹھتے ہیں۔ اس وقت راقم کے پیش نظر انٹرمیڈیٹ کی اردو نظم و نثر کی دونوں کتابیں بہ عنوان 'ادبی پارے' موجود ہیں۔ ان کتابوں کا نصاب 1956 میں ترتیب دیا گیا تھا۔ دونوں کتابوں کا پیش لفظ یکساں ہے اور صفحات کی مجموعی تعداد محض 359 ہے۔ یہ کتابیں جو ابتداءً لیتھو کی کتابت کراکے لیتھو مشین پر شائع کی گئی تھیں، آج بھلے ہی فلم بنا کر آفسیٹ سے چھپ رہی ہوں لیکن ان کی کتابت یا کمپوزنگ دوبارہ نہیں کرائی گئی ہے۔

پیدائش کے 100ویں برس پر خصوصی پیش کش

خواجہ احمد عباس کی ڈرامانگاری

پہلی قسط

ڈاکٹر محی الدین زور کشمیری (اسسٹنٹ پروفیسر اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، ماگام، کشمیر -193401)

خواجہ الطاف حسین حالی کے خاندان سے تعلق رکھنے والے اردو، انگریزی اور ہندی کے معروف فکشن نگار، سوانح نگار، مفکر، دانشور، صحافی اور اعلا درجے کے فلم ساز خواجہ احمد عباس (1914 تا 1987) کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی وطن پانی پت میں ہی ہوئی اور اعلا تعلیم انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پھر اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے انھوں نے ممبئی کو موزوں پایا اس طرح ان کی شہرت کا ستارہ برصغیر سے باہر دنیا کے مختلف یورپی ممالک میں بھی چمکا۔ اس بات کا بین ثبوت ہمیں اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ ان کے ایک مشہور ناول 'انقلاب' یعنی Son of India کا روسی اڈیشن 90,000 کی تعداد میں چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ خواجہ احمد عباس کی کتابوں کے متعدد اڈیشن مختلف زبانوں میں اور مختلف ممالک میں شائع ہوئے، حالاں کہ اصل میں وہ اردو کے آدمی تھے۔ اردو کو انھوں نے کافی کچھ دیا۔ ان کا کل سرمایہ 72 کتابوں اور 62 فلموں پر مشتمل ہے۔

اردو میں ان پر کافی لکھا گیا۔ کچھ مضامین، رسالوں کے خصوصی شمارے، ہریانہ اردو اکادمی کی کتاب 'خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار' (ترتیب و تہذیب راج نرائن راز) ان پر مختلف یونیورسٹیوں میں ریسرچ بھی کروائی گئی۔ حال ہی میں 'آجکل' دہلی اور 'اردو دنیا' نے جون 2014 کے شمارے خواجہ احمد عباس پر ہی نکالے، لیکن جہاں ان کی ادبی، صحافتی اور فلمی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے وہیں ان کی ڈرامانگاری کے بارے میں کھل کر کچھ نہیں لکھا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی مضمون نگار نے Passing Reference کے طور پر ایک آدھ جملہ ان کے ڈراموں کے حوالے سے درج کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے ڈرامے اگر یکجا کیے جائیں تو ان پر ایک مبسوط مقالہ ضرور تیار ہوسکتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے بھی ڈرامے بکھرے ہوئے ہیں، ان کے بیشتر ڈرامے IPTA نے اسٹیج کروائے اور پھر وہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے اور مختلف رسالوں کی بھی زینت بنے۔ اس لیے ان پر یہاں الگ الگ گفتگو کرنے کی سعی کی جائے گی۔ 'زبیدہ' پہلی بار معیا سنسار دہلی کی وساطت سے شائع ہوا۔ یہ پانچ ابواب پر مشتمل ایک مکمل ڈراما ہے۔ مصنف نے ڈرامے کے موضوع کا انتخاب وہی کیا ہے جو انھوں نے اس سے پہلے اپنی چند کہانیوں کے لیے کیا تھا مطلب کہ وہ مسلم معاشرے میں پردے کے خلاف تھے۔ 'زبیدہ' انھوں نے کیوں لکھا؟ اس ڈرامے کا اصل محرک کون ہے؟ اس کے بارے میں وہ پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

"اس ڈرامے کو میں نے صرف لکھا ہے، تخلیق نہیں کیا۔ اس کا بنیادی کردار اور ڈرامائی عروج (کلائمکس) دونوں حقیقت پر مبنی ہیں۔ 'مالابار' کے ایک چھوٹے سے شہر میں بیماری پھیلی، شرفا اور سماج کے بڑے بڑے بیخ خدا کی مرضی اور بھگوان کی اچھا کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ تب ایک پردہ دار خاتون کی غیرت قومی کو حرکت ہوئی۔ وہ چار دیواری سے باہر نکل آئی اور اپنے ہم شہریوں کو بیماری کی روک تھام کے لیے للکارا۔ رفیقِ کمیٹی بنی اور باوجود مخالفت کے اس نے علاج معالجے اور شہر کی صفائی کا انتظام کیا۔ بیماری کا پھیلاؤ رک گیا، مگر جس جواں ہمت خاتون نے یہ سب کیا جان دے کر شہادت کا مرتبہ پایا۔"

ڈراما 'زبیدہ' مسلمانوں کے طبقۂ شرفا سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی باہمت لڑکی کی درد بھری کہانی ہے جسے ایک قومی سانحے نے اتنی روحانی اور اخلاقی قوت بخشی کہ وہ اپنے پورے خاندان میں برسوں سے مروج پردے کی رسم کو توڑ کر گھر کی چار دیواری سے باہر آکر لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے۔ دراصل زبیدہ کا جان کی بازی لگانے کا عزم ہی زیر نظر ڈرامے کا اصل موضوع ہے۔

'زبیدہ' میں مرزا احمد بیگ (جن کا تعلق شرفا طبقے سے ہے) کی ریاست اب برائے نام رہ گئی ہے۔ ان کے دیگر احباب حکیم ببوا، میر صاحب، لالہ جی اور خان صاحب ان ہی کے مختلف روپ ہیں۔ ان کے بیٹے احمد علی اور منتن میاں بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ زبیدہ کے والد حامد علی پڑھے لکھے شخص ہیں اور وہ انھیں اور ان کے ساتھیوں کو عقل سکھانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن جہالت کے اس نقار خانے میں ان کی آواز کون سن سکتا ہے۔ لڑکی کا باپ ہونے کی وجہ سے انھیں کھل کر جاہل بھی نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ زبیدہ کی نسبت ان کے آوارہ مزاج اور لاابالی بیٹے احمد بیگ سے طے ہو چکی ہے۔ اس ڈرامے میں مرزا احمد بیگ اپنی بیٹھک میں جنگ کے بارے میں تبصرہ کرتا ہے، جس سے اس ڈرامے میں خاصی طوالت پیدا ہوگئی ہے، مگر اس سے ڈرامے میں مزاح کا عنصر بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈراما 'زبیدہ' نہ صرف سماج میں مروج ناسور کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے بلکہ اس کے ذریعے سماج دشمن عناصر کا پردہ فاش بھی کیا گیا ہے۔ ڈراما نگار نے زبیدہ کے سماجی قیود سے باہر آنے، اس کے خدمت خلق میں جٹ جانے اور انجام کار اپنی جان قربان کردینے سے ڈرامے میں زبردست المیہ کا تاثر پیدا کیا گیا ہے۔

'زبیدہ' میں مکالمے کے تاثر کا سبب یہ ہے کہ اس کا موضوع مرکزی خیال کی وضاحت کرتے ہوئے ڈرامائی عمل کو آگے بڑھا کر نقطۂ عروج تک لے جانے میں قاری کی معاونت کرتا ہے۔ اس ڈرامے کے بھی کردار اپنی اپنی طبقاتی حیثیت اور تعلیمی استعداد کے مطابق ہی اظہار خیال کرتے ہیں، اس لیے ان کی گفتگو ہیڑ میں خاصے اضافے کا باعث بنتی ہے۔ مرزا حامد بیگ اور ان کے دوستوں کے درمیان ہونے والی بات چیت ہمیں ان لوگوں کی جہالت کے بارے میں بھی بتا دیتی ہے جس سے اس ڈرامے کے مرکزی خیال سے بھی قاری کی توجہ نہیں ہٹتی۔

اپٹا کے ڈراموں کی یہ بڑی خوبی ہے کہ پس پردہ یا پردے کے پیچھے مختلف آوازوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس تکنیک کے ذریعے ڈرامے کے تاثر میں اور زیادہ اضافہ کیا جاتا تھا۔ یہاں ڈرامے کی نوعیت دستاویزی ڈرامے کی بن جاتی تھی اور اس طرح ایک بڑے موضوع یا Subject کو بھی ایک اسٹیج ڈرامے میں پیش کیا جاتا تھا۔ ڈراما 'زبیدہ' کے دوسرے ایکٹ میں فوجی بینڈ، گولے پھٹنے، توپیں چلنے، جہازوں، ٹینکوں وغیرہ کی آوازیں سنائی جاتی ہیں۔ ان پس پردہ آوازوں یا کمنٹری سے ڈراما نگار اپنے مطلب یا نظریے کو بھی پوری طرح سے ادا کرتا ہے، مثلاً زبیدہ کے مرنے کے بعد یہ آواز آتی ہے:

ایک آواز: زبیدہ ہندستان کی بیٹی تھی، جس پر ہندستان ہمیشہ فخر کرے گا۔

دوسری آواز: زبیدہ اسلام کی بیٹی تھی۔ اس نے انسانوں کی خدمت میں جان دے کر شہادت کا درجہ پایا۔

تیسری آواز: (عورت کی) زبیدہ نے ہم عورتوں کا سر اونچا کیا۔

چوتھی آواز: (بچے کی) زبیدہ نے ہم بچوں کو موت سے بچانے کے لیے اپنی جان دے دی۔

پانچویں آواز: زبیدہ نے اپنی جان دے کر اپنے شوہر کو اپنے وطن کو زندہ کیا ہے۔

ڈراما 'زبیدہ' پہلی بار 1944 میں بلراج ساہنی کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا گیا اور اس میں دیو آنند، دمنتی ساہنی، چیتن آنند جیسے اداکاروں نے کام کیا تھا۔

"یہ امرت ہے" ایک نظریاتی یک بابی ڈراما ہے جس کا بنیادی موضوع اور مقصد یہ ہے کہ دنیا محنت کش طبقے ہی کے دم سے قائم ہے۔ کھلی نیم پرچوں کر اس دھرتی کی بنیاد ہے اور اس پر اس کے ارتقا کا دارومدار ہے، اس لیے مزدور جو مسلسل جد وجہد کی ایک علامت ہے، لافانی ہے اور حیات دائمی پانے کے لیے اسے کسی امرت یا آب حیات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ محنت ہی دراصل وہ امرت ہے جو انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

اس ڈرامے میں ایک سائنس داں امرت بناتا ہے، اس کی ایک خوراک حاصل کرنے کے لیے اس کے پاس ایک فلمی اداکارہ آجاتی ہے تاکہ وہ حیات دائمی پاکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے مداحوں کو اپنے حسن اور فن سے خوش کرتی رہے۔ ایک سامراجی سیاست داں آجاتا ہے تاکہ وہ امر ہو کر دنیا کو سامراجی شکنجے میں اور بھی بری طرح سے کس ڈالے۔ مشہور ڈکٹیٹر ہٹلر بھی یہ آب حیات سائنس داں سے اس لیے مانگتا ہے تاکہ وہ دنیا کو غیر آریائی نسلوں سے پاک صاف کردے۔ مذہب کے نام پر در پردہ تفریق کا بیج بونے والے مذہبی رہنماؤں کا نمائندہ بھی یہ آب حیات پینا چاہتا ہے۔ غرض کہ ہر وہ شخص یہ آب حیات پینا چاہتا

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

اردو دُنیا

دہلی کے ہزاروں مسلم طلبہ مادری زبان میں تعلیم کے حقوق سے محروم

طلبہ جبراً سنسکرت پڑھنے پر مجبور، پرنسپلوں نے محکمہ تعلیم کی ہدایت کو نظر انداز کیا

نئی دہلی (۳۰ اگست)۔ دہلی سرکار کے اسکولوں میں دہلی ایجوکیشن ایکٹ 1973 اور ڈی ایس ای کے رولز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقلیتوں کے بچوں کو چھٹی سے دسویں جماعت تک ان کی مادری زبان میں تعلیم مہیا کرانے کے حق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک سو سے زیادہ ایسے اسکولوں کی فہرست بھی حاصل کر لی گئی ہے جہاں مسلم بچوں کو جبراً سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔ یہ معلومات نوائے حق ویلفیئر ایسوسی ایشن نے ایک آر ٹی آئی کے جواب میں حاصل کی ہے۔

نوائے حق کے صدر اسد غازی نے آر ٹی آئی سے جو معلومات حاصل کیں اس کے مطابق حکومت قومی راجدھانی خطہ دہلی کے محکمہ تعلیم کی ویلفیئر برانچ کے جوائنٹ ڈائرکٹر ایجوکیشن نے ۲۱ مئی ۲۰۱۲ء کو تمام ڈسٹرکٹس کے اسکولوں کے پرنسپلوں کو جاری ہدایت نامہ 12/72/338TO345 F30-(33)CO-OSD/ میں اسکول میں داخلے کے وقت مائنارٹی لنگویج کے لیے ایک ریکارڈ رجسٹر رکھنے کی ہدایت تھی جس میں یہ درج کرنا تھا کہ اقلیتی فرقوں کے بچے پڑھنے کے لیے کون سی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ محکمہ نے اس کی مانیٹرنگ کے لیے قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کو کوآرڈی نیٹر کے طور پر منتخب کیا تھا۔ اس کے بعد ۱۲ جولائی ۲۰۱۳ء کو اے ڈی ای (پوسٹ فکسیشن سیل) نے اقلیتی طلبہ کے اس حق کے تحفظ کے لیے پرنسپلوں کو ہدایت دی تھی کہ ان کے اسکولوں میں کتنے اردو ٹیچروں کی کمی ہے، لکھ کر بھیجیں۔

اسد غازی کا کہنا ہے کہ افسوس کی بات ہے کہ دہلی سرکار کے اسکول پرنسپلوں نے محکمے کے ان دونوں ہی احکامات پر سنجیدگی سے عمل نہیں کیا اور نہ ہی بعد میں اسکولوں کے رجسٹر چیک کیے گئے جن میں بچوں کے والدین کو لکھنا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو تیسری زبان کے طور پر کون سی زبان پڑھانا چاہتے ہیں۔ اسکول پرنسپلوں نے پوسٹ فکسیشن کے لیے بھی اردو اساتذہ کی کوئی مانگ نہیں کی۔ انھوں نے کہا کہ دہلی کے 800 سے زیادہ اسکولوں میں سنسکرت کو لازمی طور پر پڑھایا جا رہا ہے اور جہاں مسلم بچے تیسری زبان کے طور پر اردو پڑھنا چاہتے تھے انھیں دباؤ ڈال کر یا گمراہ کر کے جبراً سنسکرت میں داخلہ دے دیا گیا۔ ایسے 100 اسکولوں کی فہرست تیار کی گئی ہے جہاں تعلیم حاصل کرنے والے مسلم بچے جبراً لازمی سنسکرت پڑھنے کے لیے مجبور ہیں۔ ان میں کئی اسکول ایسے ہیں جہاں بڑی تعداد میں مسلم بچے زیر تعلیم ہیں۔ ان میں ایس کے وی بلاک ایچ سلطان پوری (780 مسلم بچے)، گورنمنٹ گرلز سینئر سیکنڈری اسکول نتھاری (521 مسلم بچے)، ایس کو-ایڈ رانی کھیڑا (304 مسلم بچے)، ایس کے وی، سی بلاک ڈیفنس کالونی (506 مسلم بچے)، ایس بی وی تغلق آباد ایکسٹینشن (487 مسلم بچے)، جی بی ایس ایس، سی بلاک کالونی مدن پور کھادر (391 مسلم بچے) اور جی بی ایس ایس نمبر ۱ مبارک پور ڈباس (380 مسلم بچے) جیسے اسکول قابل ذکر ہیں۔

اس صورت حال سے آگاہ کرانے کے لیے نوائے حق نے تمام دستاویزات قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے چیئرمین جسٹس سہیل اعجاز صدیقی، دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین قمر احمد، قومی کمشنر برائے لسانی اقلیت پروفیسر اختر الواسع، نوڈل آفیسر مائنارٹی سیل ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن ڈاکٹر شمشاد علی، سکریٹری اردو اکادمی انیس اعظمی، چیئرمین سی بی ایس ای وینیت جوشی اور پرنسپل سکریٹری ایجوکیشن دہلی سرکار آنند مجمدار کو بھی بھیجی ہیں۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اسکولوں میں درسی کتب کی عدم دستیابی پر احتجاج

بھوپال (۱۹ اگست)۔ مدھیہ پردیش میں سرکاری جانب سے مختلف ایسے کام کیے جا رہے ہیں جن کے ذریعے اردو تعلیم کو نقصان پہنچایا جائے۔ ابھی ایم ایل بی گرلز کالج سے اردو کلاسز دوسرے کالج میں منتقل کرنے، ساگر یونیورسٹی سے اردو کے چار اسسٹنٹ پروفیسروں کو ان کی ملازمت سے ہٹانے، ڈگری درجات کو لڑکیوں کے کالج سے حمیدیہ کالج میں منتقل کرنے کے فیصلوں کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ایک نئی صورت حال سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ اسکولوں میں اردو کی درسی کتب بھی غائب ہیں۔ اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو بھوپال کے سکریٹری کلیم اختر اور نجم الاسلام نے اردو دشمنی کے اس رویے پر احتجاج کرتے ہوئے زور دیا کہ ٹیکسٹ بک کارپوریشن فوراً اردو کتابیں مہیا کرائے۔ سرکار کی سروشکشا اسکیم کے تحت طلبہ کو مفت کتب فراہم کی جاتی ہیں، لیکن اردو بچے اس رعایت سے بھی محروم ہیں۔ مراسلے میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو طلبہ کو فوراً کتابیں مہیا کی جائیں۔ اس سلسلے میں ایک میمورنڈم ٹیکسٹ بک کارپوریشن کے ڈائرکٹر کو دیا جا رہا ہے۔

(ندیم۔ بھوپال)

اردو کے تئیں حکومت کا رویہ افسوس ناک

اعظم گڑھ (۱۶ اگست)۔ اتر پردیش اردو مترجمین ایسوسی ایشن اعظم گڑھ کی ایک ماہانہ میٹنگ آج کنور سنگھ پارک میں ہوئی۔ میٹنگ میں اردو کی ترقی، اردو زبان و ادب سے متعلق عوامی بیداری، اردو مترجمین کی سرکاری نوکریوں میں پیدا ہونے والی مشکلات کے حل کے سلسلے میں گفتگو کی گئی۔ رضوان احمد نے کہا کہ اردو کے تئیں حکومت کا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی سماج میں قدر و اہمیت روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ سکریٹری شہاب احمد نے کہا کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو ملک کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح پھلے پھولے تو ہم کو اپنے گھروں اور فضاؤں میں اردو کو شامل کرنے کی مہم چلانی ہوگی۔ عمران احمد نے کہا کہ اردو کے ساتھ سرکار کا رویہ ٹھیک نہیں کہ اکثر سرکاری دفاتر سے اردو کی تختیاں غائب ہیں اور اردو مترجمین کی تقرری بھی نہیں کی جا رہی ہے۔ ضلع خازن شمر مہدی نے کہا کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے میں اردو نے اہم رول ادا کیا تھا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا تھا۔ رحمت اللہ خاں نے کہا کہ اردو کی موجودہ ترقی میں مدارس نے اہم رول ادا کیا ہے۔ محمد نعمان نے کہا کہ اردو اخبارات و رسائل اور میگزین اردو والے خود خرید کر پڑھیں اور اپنے گھروں میں بھی پڑھنے کا ماحول بنائیں۔ ظفر الجواد نے اردو اخبارات و رسائل، میگزین اور کتب کی اشاعت کرنے والے ذمہ داران کو مبارک باد دی اور کہا کہ اردو کی ترقی میں ایسے اردو دوستوں کا بھی اہم کردار ہے۔ صدارت رضوان احمد و نظامت شہاب احمد نے کی۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو مکتبوں میں زیر تعلیم بچوں کی لیاقت جانچ میں تعصب

محکمہ نے ہندی اور حساب جانچ کا خاکہ بنایا، رپورٹ کارڈ میں اردو کا ذکر نہیں

مدھوبنی، بہار (۲۳ اگست)۔ اردو مکتب میں تعلیم پا رہے تیسری سے ساتویں کلاس کے بچے بچیوں کی صلاحیت کا ٹسٹ آٹھ و ۹ ستمبر کو منعقد ہوگا۔ جانکاری کے مطابق امتحان میں صرف ہندی اور حساب کی جانچ کی جائے گی۔ ادھر تعلیمی محکمہ کے اس اعلان کے بعد اردو داں طبقے میں محکمہ کے خلاف ناراضگی دیکھی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ مذکورہ تاریخ میں منعقد امتحان میں ایسے بچے بچیاں کیا جواب لکھیں گے جو اردو مکتب میں اپنی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اردو مکتب اور ہندی اسکول کے طلبہ و طالبات کے لیے یکساں ہندی زبان میں سوالات دیا جانا سراسر اردو داں بچوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اردو مکتب کے ایک استاد کا حوالہ دیتے ہوئے سماجی کارکن ڈاکٹر شکیل نے بتایا کہ امتحان کے بعد تیار کیے جانے والے پروگریس رپورٹ کارڈ میں بھی اردو کو شامل نہیں کیا گیا ہے جو نہایت ہی افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر تعلیمی محکمے نے اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کی تو عنقریب اردو داں طلبہ و طالبات کے علاوہ ان کے سرپرست سڑک پر اتر کر احتجاج کریں گے۔ اس سے متعلق بی آر سی ستیش کمار نے بتایا کہ مذکورہ درجے کے طلبہ و طالبات کے اہلیتی جانچ کے لیے یہ امتحان منعقد ہوگا جس کے سوالات ہندی زبان میں ہوں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو اساتذہ کے تقرر کے لیے یقین دہانی

عادل آباد، تلنگانہ (۱۹ اگست)۔ کلکٹریٹ کانفرنس ہال عادل آباد میں کل جماعتی سیاسی اقلیتی قائدین کا اجلاس منعقد ہوا جس میں مختلف اقلیتی مسائل پر غور و خوض کیا گیا۔ ریاستی وزیر جنگلات و ماحولیات جوگو رامنا نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ضلع کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کل جماعتی اقلیتی سیاسی قائدین کے اجلاس کا انعقاد خوش آئند ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تعلیمی اداروں میں ٹیچرس اور اساتذہ کی کمی کے پیش نظر تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہو رہی ہیں۔ اس لیے اساتذہ کے تقرر کے لیے اقدام کیے جائیں گے۔ ایس سی، ایس ٹی، اردو واقف امیدوار نہیں ہیں، لہٰذا ایس سی، ایس ٹی کے لیے مختص اردو اساتذہ کی خالی اسامیوں کو عام زمرے میں تبدیل کیا جائے گا اور تقرر کے لیے اقدام کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے چیف منسٹر کے چندر شیکھر راؤ نے 1000 کروڑ روپے بجٹ مختص کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اس بجٹ کے ذریعے اقلیتوں کو فائدہ پہنچایا جائے گا۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم جونیئر اسکول کوڑمور کو ہائی اسکول میں تبدیل کرنے کا مطالبہ

اوولی، آندھرا پردیش (۱۹ اگست)۔ اردو ودیا کمیٹی کوڑمور کے ایک وفد نے کلکٹر کرنول جناب سی ایچ وجے موہن کو ایک یادداشت پیش کر کے کوڑمور منڈل میں واقع اردو اسکول کو ترقی دے کر اسے 10 جماعت تک کرنے کا مطالبہ کیا۔ وفد نے کلکٹر کو بتایا کہ مذکورہ اسکول میں 8 ویں جماعت تک تعلیم کا انتظام ہے، اس کے بعد اردو میڈیم کے ذریعے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے مذکورہ اسکول کے طلبہ کو مشکلات کا سامنا ہے، اس لیے طلبہ کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے دسویں جماعت تک اپ گریڈ کیا جائے۔ محمد مصطفیٰ نے بتایا کہ آٹھویں جماعت کے بعد طلبہ کو 35 کلومیٹر کا سفر طے کر کے کرنول یا پھر بیکو جانا پڑتا ہے جس کے باعث اکثر طلبہ تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ تنظیم کے جوائنٹ سکریٹری ایم ایس اے غفور نے بتایا کہ اس تعلق سے یوم آزادی کے موقع پر چیف منسٹر آندھرا پردیش جناب چندرا بابو نائیڈو سے ملاقات کر کے انھیں بھی یادداشت پیش کی گئی۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

شہرۂ آفاق اداکار دلیپ کمار کی آپ بیتی

مکرمی! ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے یکم تا ۱۷ اگست ۲۰۱۴ء کے شمارے میں میرا تبصراتی مضمون 'شہرۂ آفاق دلیپ کمار کی آپ بیتی: حقیقت اور پرچھائیاں' شائع ہوا ہے جس میں غلطی سے پبلشرز کا نام و پتا درج نہیں ہوسکا۔ اس لیے جو حضرات اس کتاب کے خریدنے کے متمنی ہیں ان کی سہولت کے لیے پبلشرز کا پتا یہاں درج کیا جارہا ہے:

Hay House Publishers India
Pvt. Ltd. Muskan Complex
Plot No.3 B2, Vasant Kunj
New Delhi-110070
E-mail: contact@hayhouse.co.in
WWW.hayhouse.co.in

(ڈاکٹر مسعود جعفری۔ حیدرآباد)

بسوں میں اردو بورڈ آویزاں کرنے کے لیے
وزیر ٹرانسپورٹ سے قمرالاسلام کا مطالبہ

گلبرگہ، کرناٹک۔ وزیر حج و اقلیتی بہبود نے وزیر ٹرانسپورٹ رام لنگا ریڈی سے این ای کے آر ٹی سی کے مضافاتی و طویل مضافاتی (سٹی اینڈ ڈسٹرکٹ) بسوں میں اردو کے بورڈس بھی آویزاں کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ یہاں سنٹرل بس اسٹیشن گلبرگہ میں منعقدہ سٹی بس ڈپو نمبر ۵ کی افتتاحی تقریب میں صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ قمرالاسلام صاحب نے مزید کہا کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک خالص اردو کا علاقہ ہے اور پوری ریاست کرناٹک میں اردو سب سے زیادہ اسی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ گلبرگہ کو گہوارۂ اردو ہونے کا شرف حاصل ہے۔ گلبرگہ اردو کے اولین نثر نگار و شاعر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ابدی آرام گاہ ہے۔ قمرالاسلام نے اس علاقے میں سیاحت کے ساتھ ساتھ اردو کو جو اس علاقے کا اہم تہذیبی ورثہ ہے، فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقعے پر قمرالاسلام نے اردو داں عوام کی سہولت کے لیے این ای کے آر ٹی سی بسوں کے بورڈس اردو میں آویزاں کرنے کے لیے وزیر ٹرانسپورٹ رام لنگا ریڈی کو توجہ دلائی۔ قمرالاسلام نے اردو مدارس کو کم از کم مدارس میں ضم کرنے کی تجویز کی پُرزور مخالفت کرتے ہوئے اس استدلال کو مضحکہ خیز بتایا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کو میٹرک کے بعد پی یو سی، میڈیکل، انجینئرنگ و دیگر پیشہ ورانہ فنی کورسز کی تعلیم کا حصول دشوار کن ہوجاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک میں پی یو سی، میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر تمام پیشہ ورانہ فنی کورسز حتیٰ کہ آئی اے ایس، آئی پی ایس کی تعلیم اردو میں ہی ہوا کرتی تھی۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

اردو میڈیم گرلز جونیئر کالج سدی پیٹ میں
فزکس اور کیمسٹری کے لکچررس کی اسامیاں خالی

سدی پیٹ، تلنگانہ (۸ اگست)۔ ڈاکٹر نا کا سی کمار (پرنسپل گورنمنٹ گرلز جونیئر کالج سدی پیٹ) نے نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اردو میڈیم طالبات کے لیے فزکس اور کیمسٹری کے لکچررس نہیں ہیں۔ تعلیمی سال کا آغاز ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں لیکن لکچررس کا تقرر عمل میں نہیں آیا، جس سے طالبات کی تعلیم متاثر ہورہی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ محکمۂ تعلیمات کو تحریری طور پر بارہا توجہ دلا چکے ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی توجہ نہیں دی گئی اور نہ کنٹریکٹ لکچررس کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ پرنسپل نا کا سی نے وظیفہ یاب لکچررس سے خواہش کی ہے کہ وہ اپنی خدمات اردو میڈیم کے لیے دیں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

سروے کے لیے مسلم علاقوں میں
اردو داں افراد کا تقرر

—— نظر محبوب نگر

محبوب نگر، تلنگانہ (۱۸ اگست)۔ ضلع کلکٹر محبوب نگر پریہ درشنی نے کہا کہ جامع گھریلو سروے کے لیے 40 ہزار سرکاری و غیر سرکاری ملازمین کا تقرر کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ گھریلو سروے کے متعلق عوام کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سروے تلنگانہ عوام کے معاشی حالات معلوم کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ پریہ درشنی نے کہا کہ سروے کا مقصد حکومت کی فلاحی اسکیموں سے مستحق اور غریب عوام کو فائدہ پہنچانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محبوب نگر مستقر اور دیگر مقامات پر جہاں اردو داں افراد کی اکثریت ہے، ایسے وارڈوں میں اردو داں افراد کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اسی طرح متصل اور نارائن پیٹ کے سرحدی علاقوں میں کنڑا زبان جاننے والوں کو سروے کے لیے مقرر کیا جائے گا۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

وزارتِ تعلیم نے اردو اساتذہ کی ریکارڈ سازی کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری قرار دیا

نئی دہلی (۱۱ اگست)۔ وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے اردو اساتذہ کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں سے پلّہ جھاڑ لیا ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم اسمرتی ایرانی نے اردو اساتذہ کی ریکارڈ سازی کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری قرار دیتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ اردو اساتذہ کا ریکارڈ رکھنا ریاستی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ وزارت برائے تعلیم کی جانب سے اردو اساتذہ کے احوال و کوائف اور ان کے تعلق سے بنیادی ریکارڈ رکھنے کی ذمہ داری سے برأت کا یہ معاملہ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب وزارت میں اردو کے فروغ کی قومی کمیٹیاں بے دست و پا بیٹھی ہوئی ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے راجیہ سبھا کے رکن کے ذریعے پارلیمنٹ میں پوچھے گئے ایک تحریری سوال کا جواب دیتے ہوئے آج اسمرتی ایرانی نے بتایا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری اور تعیناتی کا مسئلہ ریاستی حکومتوں سے متعلق ہے، اس لیے مرکزی حکومت اس کا ریکارڈ نہیں رکھتی۔

اسکولوں میں مسلم بچوں کے داخلے میں جانبداری کے تعلق سے پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں مرکزی وزیر تعلیم نے جانبداری کے الزامات کو خارج کر دیا۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ملک بھر میں مسلم بچوں کا اسکولوں میں شرح داخلہ بہت تیزی سے بڑھا ہے۔ وزیر نے مزید بتایا کہ حکومت نے اب تک ملک بھر میں 88 مسلم ارتکاز والے اضلاع کی شناخت کی ہے، جہاں ترجیحی طور پر تعلیمی ترقی کا دھیان رکھا جارہا ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو کے نام پر قائم تاریخی سٹی کالج میں اردو سے دشمنی

انٹرمیڈیٹ میں زبان دوم کی حیثیت سے صرف ہندی لینے پر دباؤ

حیدرآباد (۱۳ اگست)۔ گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد کا شمار نہ صرف حیدرآباد بلکہ ملک کے قدیم ترین تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس کالج سے کئی چیف منسٹرس، اہم سیاست داں، وائس چانسلرس، ڈاکٹرس، انجینئرس، مشہور و معروف قانون داں، مایہ ناز ادیب و شاعر اور فنکاروں نے تعلیم حاصل کی۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے کئی تعلیمی ادارے گورنمنٹ سٹی کالج کی خوب صورت عمارت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے دور میں [illegible] روپے کے مصارف سے اس تین منزلہ کالج کی تعمیر عمل میں آئی تھی اور ایک اسکول سے ترقی کرتے ہوئے یہ اب ایسے کالج میں تبدیل ہوچکا ہے جہاں انٹرمیڈیٹ سے لے کر پوسٹ گریجویشن کی سطح تک تعلیم کا انتظام ہے۔ لیکن افسوس کہ ایک اردو میڈیم اسکول کی حیثیت سے شروع ہونے والے اس کالج میں اب اردو سے ہی دشمنی کی جانے لگی ہے، اسی طرح عربی کے ساتھ بھی تعصب برتا جارہا ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے والے طلبہ کو زبان دوم کی حیثیت سے اردو اور عربی کی بجائے ہندی لینے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں طلبہ اور طلبہ کے سرپرستوں کی ایک کثیر تعداد نے دفتر 'سیاست' پر پہنچ کر بتایا کہ کالج میں اردو میڈیم کافی عرصہ قبل برخاست ہوچکا ہے، وہاں صرف انگریزی اور تلگو میڈیم میں تعلیم دی جاتی ہے۔ سٹی جونیئر کالج میں 90 فیصد مسلم طلبہ ہیں جو غریب اور متوسط خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دبیر پورہ، شاہین نگر، فلک نما، عیدی بازار، یاقوت پورہ، چندرائن گٹہ، حسن نگر، کالا پتھر، آصف نگر، جہاں نما، بہادر پورہ وغیرہ سے طلبہ اس کالج میں آتے ہیں۔ جہاں تک سٹی کالج کے انٹرمیڈیٹ سال اول کے طلبہ کا سوال ہے، ان لوگوں کی شکایت ہے کہ وہ زبان دوم کی حیثیت سے اردو اور عربی لینے کے خواہاں ہیں لیکن ہندی کے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

رفتید ولے نہ از دلِ ما

رام پور۔ اردو کے مشہور و ممتاز استاد شاعر جناب شرافت یار خاں (ہوش نعمانی) کا طویل بیماری کے بعد ۱۲ راگست ۲۰۱۴ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز جمعہ درگاہ حضرت حافظ شاہ جمال اللہ میں ادا کی گئی اور ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں عمل میں آئی۔ بہترین لب و لہجے کے 85 سالہ استاد شاعر ہوش نعمانی کافی عرصے سے صاحبِ فراش تھے۔ مرحوم ہوش نعمانی ہندوستان، پاکستان، عرب امارات میں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ ان کے اشعار اور لب و لہجے کے سامعین بڑے مداح تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'ادب گاہِ رام پور' ہے جسے رضا لائبریری نے شائع کیا تھا، جس میں ادیبوں و شاعروں کا ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک کا منظوم تعارف تھا۔ ہوش نعمانی کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ ان کی زندگی کا وقت اب ختم ہونے والا ہے، اسی لیے انھوں نے اپنے آخری مجموعے کا نام 'اختتام' رکھا۔ وہ استاد شاعر حضرت جمیل خاں نعمانی کے شاگرد تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے معروف شاعر ڈاکٹر منظور احمد نعمانی نے ۲۳ راگست ۲۰۱۴ء کی شب میں فریدآباد کے اپولو اسپتال میں اپنی آخری سانس لی۔ وہ بہار کے ضلع گوپال گنج کے رہنے والے تھے۔ مرحوم کو گزشتہ کئی سالوں سے کڈنی کا عارضہ تھا، پچھلے مہینے انھیں اپولو میں داخل کرایا گیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 سال تھی۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کا جسدِ خاکی دہلی سے بذریعۂ ایمبولنس گوپال گنج لے جایا گیا۔ منظور احمد نعمانی علم دوست، تصوف پسند شاعر، استاد اور سماجی کارکن تھے۔ کملا رائے کالج گوپال گنج سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے اپنا مکمل وقت سماجی خدمات، درس و تدریس اور ادب و ثقافت کی خدمات میں گزارا۔ انھوں نے اردو تعلیم کے فروغ میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ وہ اپنی ملازمت کے زمانے میں اردو تعلیم پر کافی توجہ دیتے تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات**
مصنف : ڈاکٹر علاءالدین خاں
ضخامت : ۳۲۷ صفحات
قیمت : ۳۹۰ روپے
ناشر : ایلاف پبلی کیشنز
ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا مشرقی
razakidak@gmail.com

اردو زبان میں بیش قیمتی کتابوں کا اضافہ روز بہ روز ہوتا ہی رہتا ہے۔ زبان و ادب کے علاوہ تہذیب و ثقافت اور تاریخ و معاشرت کے تعلق سے بھی کتابیں اردو میں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ عہد وسطی کی تاریخ میں عہد اورنگ زیب کی اہمیت تحقیقی اعتبار سے کچھ زیادہ اہم ہے۔ اس عہد کے تمام گوشوں کو منور کرنے میں محققین سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس فہرست میں ایک نام ڈاکٹر علاء الدین خاں کا ہے، جنھوں نے علما کی خدمات کے حوالے سے عہد اورنگ زیب کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی یہ تحقیقی کاوش 427 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں اظہار تشکر اور مقدمہ کے عنوان سے ڈاکٹر علاء الدین خاں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ پیش لفظ کے عنوان سے ماہر تاریخ و تحقیق پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کے ذیلی عنوانات میں سیر حاصل تحقیقی مواد کو یکجا کرکے موضوع سے بھرپور انصاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے باب میں 'مسلمانوں کا سیاسی نظریہ' کے تحت یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اسلام میں سیاسی نظام کا خاکہ موجود تھا لیکن بہت واضح نہیں تھا بلکہ اسلام میں سیاسی نظام کو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے لوگ خود قائم کر لیں۔ دوسرا باب 'مغل انتظامیہ میں علما کی حیثیت' کے عنوان سے ہے، جس میں ذیلی عنوان کے تحت عالم کی تعریف، علما کے اقسام، علما بہ حیثیت عہدیداران حکومت، دہلی حکومت میں علما کی سرگرمیاں اور مغل عہد میں علما کی اہمیت کے عنوان کے تحت مدلل بحث کی گئی ہے کہ ہر عہد میں باصلاحیت فرد اور عالم دین کو اس کی ذہانت اور علم و فضل کی بنیاد پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ تیسرا باب اورنگ زیب کی سیاسی حکمت عملی اور علما کے تحت علما کے شرعی دلائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ قاضی نے جشن تاج پوشی کا خطبہ بھی پڑھنے سے انکار کر دیا لیکن وہیں ایسے علمائے دین بھی تھے جنھوں نے شریعت کو طاق پر رکھ کر اورنگ زیب کی بادشاہت کو صحیح ٹھہرایا اور حکومت کی کرم فرمائی سے سرفراز بھی ہوئے۔ اورنگ زیب کا نظریہ بادشاہت اور حکمت عملی اسلامی فقہ کے خلاف تھی۔ وہ حکومت کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مفاد پرست علما کے غیر شرعی فتوے کی بنا پر سیاسی حکمت عملی سے حکومت کرتا رہا اور علمائے دین کا استعمال کرتا رہا۔ چوتھا باب 'عہد اورنگ زیب کے علما کے تصنیفی کارنامے' کے ذیلی عنوان کے تحت 90 تصانیف کا ذکر تحریری تذکرے کے ساتھ مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین، مولفین اور مشمولات و مضامین کے تحت فتاویٰ عالمگیری کی تدوین، تالیف، سن تصنیف اور طریقہ تالیف کے ساتھ ساتھ اس کے مولفین کا مختصراً ذکر موجود ہے جس میں 27 قاضی و مفتی کا ذکر ہے اور آخر میں اس سے متعلق چند اہم کتابوں کا بھی ذکر موجود ہے، جس میں نماز، زکوٰۃ، نکاح اور طلاق وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ نظام مال گزاری، خراج اور بخشش وغیرہ کے حوالے سے بھی تفصیل موجود ہے۔ چھٹے باب میں عہد اورنگ زیب کے علما و مشائخ کا ہندوستانی معاشرے پر اثر کے تحت متعدد علمائے دین کا ذکر اور ان کے دلائل موجود ہیں لیکن یہ بھی کہا گیا کہ عہد اورنگ زیب میں دونوں طرح کے علما موجود تھے یعنی ایک وہ جو ظاہراً بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر خلاف شرع قدم اٹھاتے تھے جب کہ علمائے باطن اپنی خوش اسلوبی سے اورنگ زیب کے خلاف شرع فیصلے کی تردید بھی کرتے تھے۔ ساتواں باب اختتامیہ ہے جس میں اس تفصیلی موضوع کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ عہد اورنگ زیب میں علما کا کردار ان کے عمل اور ذاتیات کی بنیاد پر اکثر و بیشتر مشکوک نظر آتا ہے۔ اورنگ زیب خود کو شریعت کا پاسدار بھی کہتا تھا اور خلاف شرع متعدد کام کو جبراً تسلیم کرایا۔ اس عہد میں علما اور شریعت ہی محور و مرکز رہی لیکن یہ دور مغلیہ عہد کے زوال کا دور بھی تسلیم کیا گیا اور اس کے ذمہ دار یہ غیر شرعی فیصلے اور فتوے ہی تھے جنھیں علما و مشاہیر نے بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر صحیح ٹھہرایا۔ کتاب ظاہری اعتبار سے بھی جاذب نظر ہے، امید کہ اسے حلقۂ اہل دانش میں خصوصی توجہ دی جائے گی۔

●●●

نام کتاب : **سفر تا سفر**
(سوانحی تاثرات)
مصنف : ساحل احمد
ضخامت : ۱۶۰ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : اردو بک ریویو، 1739/3
(بیسمنٹ)، نیو کوہ نور ہوٹل،
پٹودی ہاؤس، دریا گنج،
نئی دہلی-110002
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.bodki@gmail.com

'سفر تا سفر' ساحل احمد کی بے ترتیب یادوں کا سلسلہ ہے جس میں نہ صرف وہ اپنی زندگی کی بہت تلخ اور کڑوی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں بلکہ انھوں نے ہمت، استقلال اور ثابت قدمی سے کیسے ان کا مقابلہ کیا اس کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ مزید ان دوست احباب کا بھی حوالہ دیا ہے جنھوں نے وقتِ ضرورت ان سے منھ پھیر لیا۔ حالاں کہ ساحل احمد نے صرف ایسے لوگوں سے راہ و رسم رکھی جو اخلاق و شرح کے پابند تھے اور "آدمیت کے چراغ روشن رکھنے پر یقین رکھتے تھے" پھر بھی وہ ان کی ابلیسی فطرت، بغض و عناد اور کینہ پروری سے بچ نہ سکے یہاں تک کہ ان کے لیے ذرائع ابلاغ کے دروازے بھی بند کر دیے گئے۔ کتاب کا آغاز 'سوانحی تعارف' سے ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے خاندان کی سیاسی وابستگی، تعلیم، مشاغل، 'مرزا ہادی رسوا لکھنوی - حیات اور شاعری' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے اور اردو کے خیر خواہوں اور کالا دھنوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اور مفصل کڑی باب 'آخرش' میں ملتی ہے۔ اپنے بارے میں ساحل احمد لکھتے ہیں: "میرا بیشتر وقت (۱۴-۱۰ گھنٹے) عبد و عبادت، ریاضت اور لکھنے پڑھنے میں گزرتا ہے۔" دوسرے باب 'خال و احوال' میں ساحل احمد نے ۹ جولائی ۱۹۹۳ء سے لے کر دسمبر ۱۹۹۳ء تک رونما ہوئے حالات کا نقشہ جو کھینچا پیش کیا ہے کہ کیسے وہ سڑک حادثے میں شدید زخمی ہوئے اور ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال منتقل ہوتے رہے۔ یہی وہ دور تھا جب انھیں دوست احباب کے اصلی چہروں کا تجربہ ہوا جب کہ متعدد بار ایک کرم فرما مقصود الٰہی شیخ نے ان کی اعانت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ حالاں کہ ساحل احمد مستقبل میں خود نوشت سوانح لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں مگر زیر نظر تصنیف میں بھی سوانحی جھلکیاں کثرت سے ملتی ہیں۔

بہ قول ساحل احمد "رنگ و نسل، زبان و مذہب اور علاقہ و وراثت کی پاسداری خلاف آدمیت ہے" جب کہ ہمارے ملک میں بچپن سے ہی تعلیمی اداروں میں اس ذہنیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کئی نیک سیرت بزرگوں اور ہم عصروں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ علامہ اقبال سے وہ عقیدت اور پرستش کی حد تک متاثر نظر آتے ہیں، عشق کو ذریعہ خود شناسی اور نجات سمجھتے ہیں اور خود کو پہچاننے پر اصرار کرتے ہیں۔

'سفر تا سفر' میں اساطیر، قرآنی آیات اور دینی علما کے اقوال کا حوالہ دے کر ساحل احمد نے اخلاقی قدروں کے تنزل کے خلاف جنگ چھیڑی ہے اور تحریر سے ایسا لگتا ہے جیسے سارے جہاں کا درد ان کے سینے میں سمایا ہوا ہے۔ خیر اور شر کی اس جنگ میں وہ انسان کی پاک طینت اور صدق دلی کی امید کرتے ہیں۔ باب 'ارتعاش' میں زندگی، اخلاق اور ادب سے متعلق خطیبانہ اور واعظانہ انداز تحریر ملتی ہے اور کچھ معروضات قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ سلسلۂ پند و نصائح آگے بھی کئی ابواب میں ملتا ہے۔ ساحل احمد انسانی رویے کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آنکتے ہیں اور موجودہ دور میں پھیلی ہوئی بدظنی، جہالت، تنگ نظری اور محدود قومیت کو اخلاقی پستی کا انجام گردانتے ہیں۔ اس اخلاقی گراوٹ کی مثالیں انھوں نے کثرت سے باب 'نہیں' تحریر میں دی ہیں۔ ساتھ ہی وہ ماحول کی کثافت کے خلاف بھی آواز اٹھاتے ہیں۔ اسلام میں در آئی بدعتوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ چند ایک شاعروں اور صحافیوں پر اپنے تاثرات، 'آہنگ' سے وابستگی، اور رائٹرس گلڈ کی کارکردگی پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ سب سے چونکانے والی بات تو یہ بتلائی ہے کہ گاؤں میں ان کے ذخیرۂ کتب کو فضول سمجھ کر نذر کیا گیا اور ان کے چھوٹے بھائیوں نے جھوٹے حلف نامے کے توسط سے ان کو موروثی جائیداد سے بے دخل کر دیا۔ ان سب صعوبتوں کے باوجود ساحل احمد کی تخلیقیت پر کوئی اثر نہیں پڑا، انھیں نہ صرف اپنے کتب خانے پر ناز ہے بلکہ اتنی ہی زیادہ تحریر کی گئی کتابوں پر فخر ہے جن کی فہرست انھوں نے کتاب کے اخیر میں دی ہے۔

'سفر تا سفر' گرچہ مکمل سوانح نہیں ہے پھر بھی مختصر سوانحی خاکے سے کچھ کم نہیں۔ اس میں ساحل احمد نے اپنی زندگی اور اپنے ماحول کے بارے میں بیباکانہ رائے پیش کی ہے۔ حسب امید ان کی تحریر میں سادگی، فصاحت، فکر اور بالیدگی ملتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں اپنے دشمنوں کی کارستانیوں کا بیان کرتے ہوئے وہ جذبات میں بہہ کر ادبی زبان سے تجاوز کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ کتاب ان کی حیات کی کشمکش اور معاصر اردو ماحول کی خامیوں کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

●●●

بقیہ: خواجہ احمد عباس کی ڈراما نگاری

صفحہ ۴ سے آگے

ہے جس کا مقصد زندگی ہوتا ہے دوسروں کو مغلوب کرنا۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ سائنس داں امرت کی ایک خوراک ان میں سے کسی کو بھی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے کیوں کہ اس کے پاس اس کی مقدار محدود ہوتی ہے اور وہ اپنی فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور کو ہی اب یہ خوراک دینا چاہتا ہے، لیکن مزدور ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دیتا ہے، وہ اس لیے کیوں کہ اس نے خود محنت کا آب حیات نوش کیا ہے، اس لیے امر ہونے کے لیے اسے کسی اور امرت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں سائنس کے ہاتھ سے یہ امرت گر جاتی ہے اور یہی اس ڈرامے کا نقطۂ عروج بھی ہے۔

مصنف نے زیر نظر ڈرامے میں اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والے کرداروں کو تخلیق کرکے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ سرمایہ اور محنت، جمہوریت اور سامراجیت اور اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام کے درمیان جدوجہد میں ملا، پنڈت اور پادری تک بھی لوگ شریک ہوتے ہیں۔“

(باقی آئندہ)

بقیہ: ظ. انصاری: چند ناتمام جھلکیاں

صفحہ ۸ سے آگے

اتنے میں فٹ پاتھ پر ایک چھجے کے نیچے ایک مونگ پھلی والا لڑکا نظر آیا۔ چلتے چلتے اس کے پاس رک گئے۔ جیب سے چونی نکال مونگ پھلی خریدی، کاغذ کے دونے سے ایک مٹھی مونگ پھلیاں لے کر دونا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر وہیں کھڑے ہو کر مونگ پھلی کھاتے ہوئے مونگ پھلی والے سے باتیں کرنے لگے۔ ”کہاں کے رہنے والے ہو؟ بمبئی میں کب سے ہو؟ روزانہ کتنا کما لیتے ہو؟ وغیرہ۔ پھر مونگ پھلی والے سے کاغذ کا ایک خالی دونا لیا اور مونگ پھلی کے چھلکے اس میں ڈالتے رہے۔ واپسی میں دفتر تک آتے آتے مونگ پھلیاں ختم ہو گئیں۔ چھلکے باہر رکھے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ اکیڈمی سے چپراسی بیدی نمبر، لے آیا تھا۔ ”ٹائٹل پر بیدی کی تصویر دیکھ کر اطمینان میں گردن ہلائی اور اوپر دفتر میں اس نوٹ کے ساتھ بھجوا دیا کہ ”مضمون کے ساتھ تصویر بھی چھپے گی۔“ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے ”دیکھا میاں! اردو کے اتنے بڑے ادیب کی تصویر حاصل کرنے کے لیے کتنی مشقت کرنی پڑی۔ یہ ہے ہماری اردو صحافت...“ میں کیا بولتا... گردن ہلا کر رہ گیا۔

(5)

جس زمانے میں وہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین تھے انہی کی نگرانی میں اکیڈمی کی جانب سے عصری مراٹھی ادب کا انتخاب اردو میں اور اردو ادب کا انتخاب مراٹھی میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ادارت کی ذمہ داری قاضی سلیم کے سپرد کی گئی ایک لمبی چوڑی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی مگر یہ کمیٹی صرف نام کے لیے تھی انتخاب اور ترجمے کا سارا کام ڈاکٹر رام پنڈت، ڈاکٹر یونس اگاسکر اور میرے ذمے تھا۔

اس دوران ظ صاحب سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ اورنگ آباد سے قاضی سلیم بھی آ جاتے تھے۔ ظ صاحب کی مراٹھی ادب سے خاص واقفیت نہیں تھی مگر اردو ادب کی مجموعی صورت حال پر ان کی گہری نظر تھی۔ جب ادب کے کسی مسئلے پر لب کشا ہوتے تو پرت پرت کھول کر رکھ دیتے۔ ان کی گفتگو کا ڈرامائی انداز مسحور کن تھا۔ باتیں کرتے تو ایسا معلوم ہوتا ہم لفظوں کو بن ٹھن دیکھ رہے ہیں گفتگو میں پیکر تراشی کا ہنر صرف وہی جانتے تھے۔ ان کا خیال آتا ہے تو بے اختیار میر کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(6)

غالباً ۱۹۸۹ء کی بات ہے۔ معلوم ہوا کہ ظ صاحب کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ علاج کے لیے ماسکو جانے والے ہیں ایک دن انور قمر اور میں ان سے ملنے پہنچے۔ انور قمر نے انہیں فون کر دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ ڈنر ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بلڈنگ کے نیچے ہمارے منتظر تھے۔ کہیں سے بھی بیمار نہیں لگ رہے تھے، چہرے کی تازگی اور لہجے کی شگفتگی میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ ہم نے ٹیکسی لی اور ہوٹل سلور پلیٹ پہنچے اگرچہ اس سے پہلے کئی بار ہم ان کے ساتھ شغل بادہ و جام سے سرفراز ہو چکے تھے تاہم ان کی ناسازیٔ طبیعت کے پیش نظر انور قمر نے احتیاطاً ان سے ڈرنک کے بارے میں پوچھ لیا تھوڑے پس و پیش کے بعد بولے۔

”برانڈی کا ایک آدھ پیگ چل جائے گا۔“

ان کے لیے ان کی پسندیدہ نپولین برانڈی منگائی گئی ہم نے بیماری کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے ”ابھی تشخیص نہیں ہوئی ہے مگر پیٹ ہی کا کوئی عارضہ ہے۔“ ہم نے پوچھا۔

”ہمارے یہاں بھی ایک سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر ہے پھر آپ 'ماسکو' کیوں جا رہے ہیں؟“

بولے۔ ”یہاں علاج مہنگا ہے۔ وہاں سہولت ہے۔ ویسے بھی ماسکو کا پھیرا لگائے ایک عرصہ ہو گیا۔ تھوڑا سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔“

ان دنوں ماسکو میں سیاسی ہلچل شروع ہو چکی تھی۔ گورباچیف کی پالیسی نے متحدہ روس کی دیواروں میں شگاف ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ ظ صاحب نے اپنی گفتگو کے دوران کچھ اشارے بھی کیے تھے جو بعد میں درست ثابت ہوئے۔

چند روز بعد معلوم ہوا کہ ظ صاحب ماسکو کے لیے روانہ ہو گئے ہیں، پھر تقریباً دو ایک ماہ بعد خبر آئی کہ روس میں ان کا خاطر خواہ علاج نہیں ہو سکا غالباً اس کا سبب وہی روس کا اندرونی سیاسی انتشار رہا ہوگا۔ پھر یہ خبر آئی کہ انہیں علاج کے لیے روس سے لندن روانہ کر دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں لندن میں مشہور صحافی کلدیپ نیر بھارت کے سفیر تھے۔ ان کی سفارش پر ظ صاحب کو وہاں کسی بڑے ہسپتال میں بھی داخل کیا گیا مگر مرض، خطرے کی حدود پار کر چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور ظ صاحب کو ممبئی روانہ کر دیا گیا۔

(7)

ان کے ممبئی پہنچنے کے بعد کسی نے بتایا کہ ظ صاحب سخت بیمار ہیں انہیں کینسر ہو گیا ہے۔ بہت دبلے ہو گئے ہیں بال اڑ گئے ہیں ہاتھوں میں رعشہ آ گیا ہے وغیرہ۔ یہ بھی بتایا گیا کہ ماسکو میں ان کے ساتھ بڑی بے اعتنائی برتی گئی اب وہ روس اور کمیونزم سے اس قدر بدظن ہیں کہ اس زمانے کی اپنی ساری تحریروں سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ اور جو بھی ملنے جاتا ہے اس سے قرآن اور حدیث کی باتیں کرتے ہیں اور کمیونزم کو برا بھلا کہتے ہیں۔ میں بھی عیادت کو جانا چاہتا تھا مگر اکیلے جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر خبر ملی کہ ”سیفی اسپتال میں داخل کیے گئے ہیں۔“ میں حسب معمول سنیچر کی شام کو مکتبہ جامعہ گیا وہاں انور خان بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساتھ چلنے کو کہا وہ بولے۔ ”میں کل ہی گیا تھا بہت برا حال ہے دیکھا نہیں جاتا۔“

میں اکیلا ہی اسپتال چلا گیا۔ ان کے بیڈ کے پاس کوئی خاتون بیٹھی ہاتھ میں کوئی سپارہ لیے پڑھ رہی تھیں۔ دو لوگ پائنتی کھڑے آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ بیڈ پر ایک نیم مردہ ڈھانچہ سا پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا یہ ظ صاحب تھے۔

ناک سے آکسیجن کی ٹیوب لگی تھی۔ بال اڑ چکے تھے۔ گال پچک گئے تھے۔ اندر کو دھنسی ادھ کھلی آنکھیں خلا میں ٹنگی تھیں۔ ایک نظر میں پہچاننا مشکل تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر آہستہ سے آداب کیا۔ آنکھوں میں کچھ جنبش سی ہوئی تھوڑی دیر تک میری جانب نگراں رہیں پھر دوبارہ خلا میں کھو گئیں۔ میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر بھاری من سے مڑا۔ پائنتی کھڑے ایک صاحب نے کہا۔

”کسی کو پہچان نہیں رہے ہیں۔“

میں گردن جھکائے چپ چاپ باہر نکل آیا۔

جو لوگ زندگی بھر مذہب بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں زندگی کے آخری پڑاؤ پر جب قویٰ مضمحل اور اعصاب معطل ہو جاتے ہیں تو مذہب کی دیوار کا سہارا لیتے ہیں۔ ظ صاحب کا معاملہ ذرا جدا گانہ تھا۔ ان کی کمیونزم سے بیزاری اور مذہب کی جانب 'مراجعت' کی وجہ صرف اتنی تھی کہ روس میں ان کی حسب توقع پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔ کہتے ہیں جب حضرت ابو طالب مرض الموت میں مبتلا تھے تب آنحضور صلعم نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ ابو طالب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں نے عمر بھر اپنے آبائی مذہب کی پاسداری کی ہے۔ اب آخر وقت میں اس سے منحرف ہونے کو دل نہیں مانتا۔ حضور اکرمؐ خاموش ہو گئے۔

حضرت ابو طالب کے انتقال کے بعد صحابہؓ نے حضورؐ سے دریافت کیا۔

”یا رسول اللہ! ابو طالب جنت میں جائیں گے یا جہنم میں؟“

حضورؐ نے فرمایا۔ ”جہنم میں...“

پوچھا گیا۔ ”وہ کس عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے؟“

فرمایا... ”انہیں آتشی کھڑاؤں پہنائے جائیں گے۔ یہ جہنم کا کمترین عذاب ہے۔“

ظ صاحب کے انتقال کے بعد ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظ صاحب جنت میں جائیں گے یا جہنم میں...؟“

ممکن ہے اپنے آخری ایام کی توبہ کے باعث انہیں جنت میں داخل کر لیا گیا ہو۔ اور وہ جنت کے کسی گوشے میں بیٹھے ملا مولویوں سے بحث مباحثہ میں مصروف ہوں۔ مگر یہ محض قیاس ہے۔ البتہ اگر وہ تائب نہ ہوتے تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ وہ بھی آتشی کھڑاؤں پہنے جہنم میں حضرت ابو طالب کے ساتھ چہل قدمی کر رہے ہوتے۔

واللہ اعلم... ●●

بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

ایک لیکچرر طلبہ پر عربی اور اردو کی بجائے ہندی لینے پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایس ایس سی میں چوں کہ زبان دوم ہندی تھی۔ انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے وہ اپنی پسند سے زبان دوم کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم الحروف نے ریجنل انسپکٹر آفیسر فی روی کمار سے فون پر ربط کیا۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتے رہے اور دوبارہ فون کرنے پر ایسا لگا کہ میڈیا کا نام سن کر فون ریسیو نہیں کیے۔ طلبہ کے مطابق وہ دو دو روز سے آتے ہیں ایسے میں اگر پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہوتی ہے تو کالج میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔ اس طرح جان بوجھ کر ان کا سارا دن خراب کیا جاتا ہے۔ انٹرمیڈیٹ سال دوم کے طلبہ کی شکایت ہے کہ ان سے سال دوم کی فیس لینے میں ٹال مٹول سے کام لیا جا رہا ہے کیوں کہ اگر یہ فیس نہ لی جائے تو سال دوم میں داخلہ ہی باقی نہیں رہتا۔ اس طرح یہ طلبہ سال دوم کے امتحانات نہیں لکھ سکتے۔ ڈگری کالج میں بھی طلبہ کے ساتھ امتیازی رویہ برتے جانے کی شکایات عام ہیں۔ ڈپٹی چیف منسٹر محمود علی چوں کہ کے سی آر حکومت میں واحد مسلم نمائندہ ہیں، اس لیے انہیں اس بارے میں توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ظ انصاری چند ناتمام جھلکیاں

سلام بن رزاق (B-603، نیو آکار سی ایچ ایس، بالمقابل حیدری مسجد، نیا نگر، میرا روڈ (ایسٹ)
تھانے-401107 —— Email: zahirzahida@gmail.com

(1)

ظ انصاری (مرحوم) سے میری کئی ملاقاتیں رہی ہیں مگر اس وقت ان ملاقاتوں کی چند دھندلی سی جھلکیاں ہی ذہن میں محفوظ رہ گئی ہیں۔ انھیں پہلی بار میں نے مکتبہ جامعہ میں دیکھا تھا۔ سال تو ٹھیک سے یاد نہیں مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں ہر سنیچر کو مکتبہ جامعہ کی ہفتہ واری محفل میں باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ جناب باقر مہدی، ندا فاضلی، فضیل جعفری، یوسف ناظم، مرزا عزیز جاوید، محمود سروش، زکریا شریف، ابوبکر مرچنٹ، محمود چھاپرا، اقصدیق سہارودی اور انور خان وغیرہ اس محفل کے مستقل شرکا تھے۔ کبھی کبھی وہاں جناب سردار جعفری، اختر الایمان، جان نثار اختر اور ظ انصاری جیسے مشہور ادبا اور شعرا کا بھی پھیرا ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن سفید بش شرٹ پتلون میں ملبوس، بغل میں کوئی موٹی سی کتاب دبائے سرخ و سفید رنگت والا ایک پُرکشش شخص مکتبہ میں داخل ہوا۔ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خان سمیت تمام حاضرین کھڑے ہو گئے۔ یوسف کھتری نے بتایا کہ یہ ظ انصاری ہیں۔ ظ انصاری نے دو چار شناسا چہروں سے مصافحہ کیا۔ شاہد علی خان سے کسی کتاب کے بارے میں کچھ دریافت کیا۔ باقر مہدی سے دو ایک فقروں کا تبادلہ کیا اور جس سرعت سے آئے تھے اسی سرعت سے باہر نکل گئے۔

(2)

۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ شمس کنول کے رسالہ 'سنگم' کا ہندوستانی مسلمان نمبر شائع ہوا تھا۔ اس کی رسم اجرا کی تقریب داؤد بھائی فضل بھائی ہال میں (مسجد بندر) منعقد کی گئی تھی۔ جلسے کی صدارت کرشن چندر فرما رہے تھے۔ مقررین میں ڈاکٹر ظ انصاری، راما نند ساگر، مغنی صدیقی، سلطان ڈوسل، مدہوش بلگرامی کے علاوہ انور قمر کو اور مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ ہم سب ڈائس پر بیٹھے تھے۔ ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ایک روز قبل ہی ایمرجنسی کا اعلان ہوا تھا مگر حاضرین میں کسی کو ایمرجنسی کا خیال بھی نہیں تھا۔ اپنی باری پر ظ انصاری تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ اپنے ابتدائی کلمات میں ہی ہندوستانی مسلمان اور اردو فنکاروں کی بے خبری بلکہ بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''آج اخبار میں ایمرجنسی کے خلاف ہندوستان کے تقریباً تین سو ادیبوں اور صحافیوں نے اپنا احتجاج درج کیا ہے مگر افسوس اس احتجاج نامے پر اردو کے ایک بھی ادیب یا صحافی کے دستخط نہیں ہیں''۔

ہم نے ڈائس پر سے دیکھا ظ صاحب کی زبان سے ان کلمات کا ادا ہونا تھا کہ شرکا میں سے کم سے کم تین سادہ لباس والے سی آئی ڈی کے جوان تیزی سے اٹھے اور دروازے پر جا کر ایستادہ ہو گئے۔ باہر پولس وین موجود تھی وہاں بھی کچھ ہلچل شروع ہو گئی۔ سب کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ انہونی ہونے والی ہے۔ کرشن چندر کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ انھوں نے ظ انصاری کی تقریر درمیان ہی میں رکوا دی اور انھیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پولس والوں نے جلسے کی کارروائی میں تو مداخلت نہیں کی مگر جلسہ ختم ہونے کے بعد کرشن چندر، سلطان ڈوسل اور ظ انصاری سے کچھ باز پرس ضرور کی۔ کرشن چندر نے اپنے طور پر کچھ صفائی پیش کی اور بات آئی گئی ہو گئی۔

(3)

میرے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'معبر' شائع ہوا تھا۔ میں مجموعے کا ایک نسخہ لے کر ظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ظ صاحب نے کتاب ہاتھ میں لے کر اس کے سرورق کو غور سے دیکھا پھر کتاب کا نام باآواز بلند پڑھا ''معبر، یعنی رہ گزر، دریا عبور کرنے کی جگہ''۔ میں قدرے پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ کتاب کا نام معبر نہیں معبّر تھا میں نے جھجکتے ہوئے کہا: ''ڈاکٹر صاحب معبر نہیں 'معبّر' ہے''۔ انھوں نے ایک بار پھر سرورق پر نگاہ ڈالی اور بولے... ''اچھا اچھا معبر خواب کی تعبیر بتانے والا مگر ب کے نیچے زیر کہاں ہے... خیر عنوان ذرا مشکل ہے مگر اچھا ہے''۔

(4)

غالباً بیدی صاحب کی پہلی برسی کا موقع تھا۔ میں نے بیدی صاحب پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا ''راجندر سنگھ بیدی چند باتیں چند یادیں''۔ ظ صاحب روزنامہ 'انقلاب' کے مدیر تھے۔ میں نے ظ صاحب کو فون کیا کہ اگلے ہفتے بیدی صاحب کی پہلی برسی ہے میرے پاس ایک چھوٹا سا مضمون ہے اگر آپ اجازت دیں تو انقلاب کے سنڈے ایڈیشن کے لیے روانہ کروں کہا: ''مضمون لے کر فوراً آؤ''۔

میں مضمون لے کر انقلاب کے دفتر پہنچا۔ ظ صاحب اپنے کیبن میں بیٹھے تھے۔ میں نے مضمون پیش کیا۔ مضمون پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی، بیل بجائی اور چپراسی کو بلا کر مضمون کتابت کے لیے دے دیا۔ پھر بولے، ''مضمون کے ساتھ بیدی کی تصویر بھی شائع ہو گی اور مجھے نہیں لگتا کہ یہاں دفتر میں بیدی کی کوئی تصویر ہو گی''۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ حال ہی میں 'عصری آگہی' کا بیدی نمبر شائع ہوا ہے۔ سرورق پر بیدی کی تصویر چھپی ہے۔ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''نمبر کہاں ملے گا؟'' پھر خود ہی گویا ہوئے۔ ''اکیڈمی میں دیکھتے ہیں۔'' اسی وقت اکیڈمی کے دفتر میں فون کیا اور وہاں غالباً شاہد ندیم یا کسی اور سے کہا کہ ''بیدی نمبر فوراً انقلاب کے دفتر بھجوا دو۔'' اتنے میں چائے آ گئی چائے پیتے پیتے بولے۔ ''تمہارا یہ مضمون کل 'انقلاب' میں چھپ جائے گا۔ اگلے ہفتے اردو اکیڈمی کی جانب سے بیدی پر ایک جلسہ ہونے جا رہا ہے تم اس جلسے کے لیے بیدی پر ایک اور مضمون لکھو... میں چاہتا ہوں اس جلسے میں بمبئی کی نئی نسل کی بھی نمائندگی ہو۔''

میں نے کہا... ''اگر آپ کہیں تو یہی مضمون پڑھ دوں۔''

بولے ''نہیں... یہ مضمون اخبار کے لیے ٹھیک ہے جلسے کے لیے مناسب نہیں۔''

میں نے دامن بچاتے ہوئے کہا ''اتنے کم وقت میں بیدی پر مضمون لکھنا مشکل ہے۔''

بولے ''مضمون نہ سہی کسی افسانے کا تجزیہ کر دو۔''

بادلِ نخواستہ میں نے ہامی بھر لی۔ چائے ختم ہو چکی تھی۔ میں رخصت ہونے لگا۔ بولے۔ ''رُک جاؤ... چپراسی رسالہ لے کر آتا ہی ہو گا۔''

میں خوش ہو گیا کہ ان کے ساتھ مزید تھوڑا وقت گزارنے کا موقع ملا۔ شاید اس وقت وہ بھی فرصت میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔ ''چلو جب تک باہر ٹہل کر آتے ہیں۔'' باہر نکل کر انٹرکانٹینینٹل مارکیٹ کی طرف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ وہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ چل رہا تھا۔ بیدی کے فکشن کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''منٹو کے بعد ہمارے درمیان سے اردو کا بڑا افسانہ نگار اٹھ گیا''۔ میں نے کہا۔ ''اور کرشن چندر؟''

بولے۔ ''وہ بھی بڑے افسانہ نگار تھے مگر بیدی کا قد ان سے ذرا اونچا ہوا تھا''۔

میں نے پوچھا۔ ''اگر تجزیہ کرنا پڑے تو بیدی کے کس افسانے کا تجزیہ کیا جائے؟''

''تم نے بیدی کے کون کون سے افسانے پڑھے ہیں؟''

میں نے چار پانچ افسانوں کے نام لیے۔ بولے۔ ''کلیانی کیسا رہے گا۔''

میں نے کہا۔ ''افسانہ تو اچھا ہے مگر وہ تو منٹو کے رنگ کا افسانہ ہے۔''

کہنے لگے۔ ''نہیں... اسے غور سے پڑھو پورا افسانہ ہندو میتھالوجی کے رنگ میں لکھا ہوا ہے۔''

میں چپ ہو گیا بعد میں جب میں نے دوبارہ کلیانی کو پڑھا تو ظ صاحب کی بات کی تصدیق ہو گئی اور میں نے اسی پہلو کو ذہن میں رکھ کر کلیانی کا تجزیہ کیا۔

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ... آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲-راؤز ایونیو نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
http://www.atuh.org